

ہندوستان میں تاریخی دعوتِ اسلامی کا ایک باب

بجانب ابوسلمہ شاہجہانپوری

تحریکِ نظمِ جماعت



حضرت اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید بریلوی (رحمۃ اللہ علیہما) کی تحریکِ جہاد اور اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کی مساعی کی ناکامی کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوتِ قیامِ نظامِ جماعت، برصغیرِ ہند میں اس ناکامی کا لفظِ اختیار کیا گیا تو یہ لغوی معنی میں ہے حقیقت میں ناکامی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے تو ان ارواحِ مقدسہ کی کامیابی کے لیے یہ بات پس کرتی ہے کہ انہوں نے خالصاً لوجہ اللہ مسلمانوں کے دینی و ملی مفاد کے تحفظ و بقا کے لیے قدم اٹھایا اور اپنے پورے وسائل کو بروئے کار لاکر اپنی پوری سعی و صلاحیتوں کو استعمال کر کے اپنی جان اور اپنے مالوں کی پروا نہ کر کے، زندگی کی عشرتوں اور راحتوں کو تھوڑا کر، پورے اخلاص کے ساتھ، پوری مستعدی اور جانفشانی کے ساتھ، انسانی سعی و جہد کے آخری مراحل تک جا کر اپنی جانیں آفریں کے سپرد کر دیں۔ اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جس کی ان سے توقع کی جائے؟ جنہوں نے میقّم زندگی کی آسائشوں کی بجائے مسافرت کی تکالیف کو اختیار کر لیا ہو، گھر کے عشرتوں کی بجائے میدانِ جہاد کی مشقتوں کو اور نرم و گداز بستروں کی جگہ پتھر پر فرش میں اپنی راحتِ دل و جان کا سامان ڈھونڈا ہو۔ جن کی نگاہوں کو میدانِ جہاد کا خونین منظر گل و گلشن کی رنگینوں اور دل کشیوں سے زیادہ محبوب ہو جنہوں نے صرف رضا کے الہی کے لیے دیبا و حریر کی پوشاکوں پر سلی کی بجائے کھلی مگر خونِ شہادت کے پھینٹوں سے آلودہ تباہ و تاراج کو ترجیح دی ہو۔ اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جس کا ان سے مطالبہ کیا جائے جن کے لیے پہلی ہی مشارِ شہادتی گئی ہو کہ **اِنَّ اللہَ اشَدُّ مِنِ الْمُؤْمِنِیْنَ** (اللہ ان سے زیادہ مضبوط ہے) (باقی اگلے صفحہ پر)

پاکستان میں پہلی اسلامی تحریک تھی جو حالات و مصالح و وقت کی پوری بصیرت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے ملی مفاد کے تحفظ کے لیے دی گئی تھی جس میں مسلمانوں کے امراض اجتماعی کی صحیح تشخیص کی گئی تھی اور ان سے نجات کے لیے علاج اور طریق علاج بھی صحیح تجویز کیا گیا تھا۔

مسلمانوں کی حالت

مولانا آزاد نے برصغیر اب سے نصف صدی پہلے دی تھی۔ اس مدت میں دنیا میں اور خود اس برصغیر پاک و ہند میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہو چکے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی دستوری حیثیت میں زمین و آسمان کا فرق پڑ چکا ہے۔ پہلے وہ ایک محکوم قوم تھے۔ آج وہ حکومت و اقتدار میں برابر کے شریک ہیں لیکن اس انقلاب عظیم کے باوجود وہ جماعتی زندگی کی اس معصیت میں مبتلا ہیں جس سے نجات کے لیے مولانا آزاد نے نظم جماعت اور امارت شرعیہ کا نسخہ شفا تجویز کیا تھا اور اگر یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو جماعتی زندگی کی اس معصیت سے نجات نہیں ملی تو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے آج بھی اس کے سوا کوئی اور نسخہ شفا اور راہ فوز و نجات نہیں۔ اگر وہ بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اپنے ملی وجود کو قائم رکھنے اور ملک کی سیاست میں اپنے آپ کو ایک فعال اور مؤثر قوت ثابت کرنے کے خواہاں ہیں تو انہیں نظم جماعت کے قیام سے مفر نہیں۔

پاکستان میں روزِ اول سے اگرچہ مسلمان حکومت قائم ہے لیکن صحیح اسلامی زندگی سے یہاں بھی اتنی ہی دوری ہے جتنی ہندوستانی مسلمانوں کو ہے۔ مسلمانوں میں افتراق و تشتت کی حالت اس سے زیادہ شدید ہے۔ آج کل خاص طور پر انتشار کی یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور یہ اس بات کی

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) ان کے لیے اس سے بڑی کاسیابی اور کیا ہوگی کہ وہ اپنے عہد میں پورے اترے اور رضی اللہ عنہم درضوا عنہم کا مقام محبوبیت حاصل کر لیا۔

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہ کن بازی اگرچہ پانہ سکا سر تر کھو سکا !

کس منہ سے اپنے آپ کو کتا ہے عشق باز اسے رو سیا تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا !

ناکامی کا داغ ان کے لیے کیرں بوتا؟ یہ ذلت تو ان کے لیے ہے جن کی نیتیں اخلاص و لہیت سے تہی ہیں جن کے قلوب عزم اور رک حلاوت سے نا آشنا ہیں اور جو اپنے پائے اقدام و سعی فی سبیل اللہ کو توڑ بیٹھتے ہیں۔

دلیل ہے کہ اس دعوت کی جس طرح ہندوستان میں آج بھی ضرورت ہے اس طرح پاکستان میں بھی فرق صرف یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ ضرورت مستقل ہوگی۔ پاکستان میں ”صحیح اسلامی حکومت“ کے قیام تک اس کی ضرورت بہر صورت ہے۔ صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے بعد اس دعوت کا مقصد بطریق احسن پورا ہو جائے گا۔ فی الحال اس دعوت اور تحریک کی ضرورت کے دونوں ملکوں میں ہے اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا ایک ملی معصیت ہے۔ لیکن یہاں میرا مقصد دعوت نہیں صرف تاریخی تذکرہ مقصود ہے۔

مولانا نے جب یہ دعوت دی تو ہندوستان میں مسلمانوں میں نہ کوئی رشتہ انسلاک تھا، نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ تھا۔ نہ ان کا کوئی قائد اور امیر تھا اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع۔ محض ایک بھیڑ مٹھی، ایک انبوہ تھا، ایک گلہ تھا جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا تھا اور ایک حیات غیر شرعی و جاہلی مٹھی جس میں پوری اقلیت مبتلا تھی۔

ان حالات میں مولانا نے نظم جماعت کی ضرورت کو محسوس کیا اور مسلمانوں کو اس کے قیام و اختیار کی دعوت دی۔

نظم جماعت سے مقصود

نظم جماعت سے مراد یہ تھی کہ تمام لوگ احکام نظم شرع کے مطابق ایک صاحب علم محل مسلمان امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع ہو جائیں۔ وہ ان کا امام ہو وہ جو تعلیم دے ایمان و صداقت کے ساتھ قبول کریں اور قرآن و سنت کے ماتحت مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے لیے اس کے جو احکام ہوں ان کی بلا چون و چرا تعمیل و اطاعت کریں۔

مسئلے کے مختلف پہلو

مسئلہ نظم جماعت کے کئی پہلو اور اس کی کئی حیثیتیں ہیں۔

اولاً۔ اس کی اسلامی و شرعی حیثیت یعنی مسلمان خواہ کسی ملک کے باشندے ہوں، ان کا گرد و پیش ایک دوسرے سے خواہ کتنا ہی مختلف ہو اور ان کی دستوری و سیاسی حیثیت خواہ کچھ بھی ہو ان کے لیے نظم جماعت کی شرعی حیثیت کی ہے اور اس کے ترک و اختیار کا شرعی حیثیت سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی سے کیا تعلق ہے؟

ثانیاً۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے مخصوص حالات اور سیاسی گرد و پیش میں، اگر مسلمان بحیثیت ایک مسلم وحدت کے زندہ رہنا اور اپنا اسلامی وطنی وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اس مسئلے کی اہمیت کیا ہے؟

ثالثاً۔ ہندوستان کے خاص حالات میں اگر مسلمان ایک متحدہ سیاسی قومیت کے اہم عنصر کی حیثیت سے قومی و ملکی فرائض و حقوق کی منزلوں سے گزرنا۔ سیاسی زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینا، ایک مؤثر سیاسی قوت کی حیثیت میں ہندوستان کے مطلع سیاست پر ابھرنا اور معاشی و اقتصادی دور میں حصہ لینا چاہتے ہیں تو نظم جماعت کا قیام ان کے لیے کیا اہمیت رکھتا ہے؟

رابعاً۔ اگر ہندوستان کے مسلمان نظم جماعت قائم کر لیتے ہیں تو ان کا یہ عمل صالح مسئلہ خلافت، اور مسلمان ملکوں کی سیاست میں اور ان کے فرائض کی ادائیگی میں کس درجہ مفید اور نفع ہوگا؟

مولانا نے مسئلے کے ہر پہلو پر اس کی اہمیت کے مطابق بحث کی ہے یا کم از کم ضروری اشارات کیے ہیں اور اہل علم و اصحاب نظر کو توجہ دلائی ہے۔

نظام جماعت کی شرعی حیثیت

یہ مسئلہ اپنے تمام پہلوؤں اور اپنی تمام حیثیتوں سے مسلمانوں کے تمام اعمال و اقدام کے لیے بنیادی اصل و اساس کے ہے۔ اسلام اور اسلامی زندگی کی تمام برکات و حسنات نظام جماعت سے وابستہ ہیں اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی حیات جاہلی و غیر شرعی ہے جسے وہ گزار رہے ہیں مسئلے کی اسلامی و شرعی حیثیت کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:-

”اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کے لیے بنیادی حقیقت، یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں بھی فردائی، متفرق، الگ الگ اور مشتت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع، موٹلف، متحد اور کنفیس واحد ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و سنت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا ہے اور کفر و شرک کے بعد کسی بد عملی سے بھی اس قدر اصرار و تاکید کے ساتھ نہیں روکا جس قدر تفرق و تشتت سے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام و اعمال میں یہ حقیقت اجتماع بنیاد مرکز و محور کے قرار پائی اور تمام دائرہ عمل اس کے گرد قائم کیا گیا حقیقہ توحید سے لے کر تمام معاملات و اعمال تک یہی حقیقت مرکز و محور طرازی کر رہی ہے اور

اس بنا پر بار بار نظم جماعت پر زور دیا گیا ہے کہ :-
عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ۝

اور :-

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنِ الشَّيْطَانُ مَعَ الْفِتْرِ وَهُوَ مِنَ
الْأَشْيَاءِ الْفَعْدَةِ ۝

اور :-

”اِذَا كَانَ ثَلَاثٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤْمَرْ مِنْهُمْ اِحْدَهُمْ“ ۝
اور اسی لیے نظم و نظام ملت کے لیے منصب خلافت کو قرار دیا گیا ہے کہ تمام متفرق کڑیاں
ایک زنجیر میں منسلک ہو جائیں۔
ہندوستان کے مسلمان اور مسئلہ نظم جماعت

ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مسئلہ نظام جماعت کی اہمیت یہ تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی
اصلاح حال اور ادائے فرائض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی جیت
انفرادی کو ترک کر کے جماعت اجتماعی و شرعی اختیار نہ کر لیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی
جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہو جائے۔ مولانا کے نزدیک تمام اعمال اصلاحیہ اور تمام مقاصد اصلاح و
مصالح انقلاب کا نفاذ و نفوذ اسی کے قیام و وجود پر موقوف تھا۔ اس کے بغیر نہ توحید و تہجد
ملت اور قیام شرع و ادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی راہ بیدار ہو سکتی تھی۔ نہ ملکی سیاست اور آزادی کی
جدوجہد میں اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور بحیثیت جماعت کے اپنی ہستی برقرار رکھ
سکتے تھے۔

”مسلمانوں کے لیے راہ عمل ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور ہمیشہ کی طرح اب بھی ایک
ہی ہے یعنی ہندوستان کے مسلمان اپنی جماعتی زندگی کی اس مصیبت سے باز آجائیں جس میں
ایک عرصے سے مبتلا ہیں اور جس کی وجہ سے فوز و فلاح کے تمام دروازے ان پر بند ہو
گئے ہیں“

جماعتی زندگی کی معصیت سے مولانا کی مراد یہ ہے کہ ان میں ایک جماعت بن کر رہنے کا شرعی نظام مفقود ہو گیا ہے۔

مولانا کے پیش نظر اس کا سیاسی پہلو بھی تھا اور اس کی اہمیت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ نظام جماعت کے قیام سے غفلت نہ برتی جائے۔ اس بارے میں انہوں نے صاف صاف اپنے اس یقین کا اعلان کیا کہ راہ شرعی صرف ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی۔ ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

۱۹۱۲ء کے لیل و نہار قریب الاقترام تھے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ حقیقت اس عاجز پر منکشف کی اور مجھے یقین ہو گیا کہ جب تک یہ عقدہ حل نہ ہو گا ہماری کوئی سعی جستجو بھی کامیاب نہیں ہوگی۔ چنانچہ اس وقت سے میں سرگرم سعی و تدبیر ہو گیا۔
خصائص منصب امامت

جس طرح مسئلہ نظم جماعت و امامت چند اصول و مقاصد سے مرکب ہے۔ اس طرح منصب امامت بھی اپنے لیے چند خصائص و اوصاف کا متقاضی ہے۔ ہر عالم دین اس کا اہل اور ہر مدرسہ نشین اس کا اسرار شناس نہیں ہو سکتا۔ مولانا آزادؒ نے منصب امامت کے خصائص و شرائط پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

ایک صاحب نظر و اجتہاد و دماغ کی ضرورت ہے جس کا قلب کتاب و سنت کے معارف و غوامض سے معمور ہو۔ وہ اصول شرعیہ کو مسلمانان ہند کی موجودہ حالت پر، ان کے توطن ہند کی حدیث العہد نوعیت پر، ایک ایک لمحے کے اندر متغیر ہو جانے والے حوادث جنگ و صلح پر ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے اور پھر تمام مصالح و مقاصد شرعیہ و ملیہ کے تحفظ و توازن کے بعد فتوے شرع صادر کرے۔

ایک اور جگہ اس منصب کے خصائص پر ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں :-

” آج ایک ایسے عازم امر کی ضرورت ہے اس کا علم مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہو۔ اس کا قدم منہاج نبوت پر استوار ہو۔ اس کے قلب پر اللہ تعالیٰ حکمت رسالت کے نام اسرار و غوامض اور معانی اتمام اور طہارت عہد و ایام کے تمام سر اثر و فضا یا اس طرح کھول دے کہ وہ

صرف ایک صحیفہ کتاب و سنت اپنے ہاتھ میں لے کر دنیا کی ساری مشکلوں کے مقابلے امدادِ ارج و قلوب کی ساری بیماریوں کی شفا کا اعلان کر دے۔

نظرِ جماعت کے قیام کی کوشش

اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۹۱۴ء میں مولانا بعض علماء سے خود ملے اور بعض کے پاس مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو بھیجا لیکن علمائے وقت نے عام طور پر اس مسئلے کی اہمیت کو نہیں سمجھا اور اعراض و انکار سے کام لیا۔ البتہ جب مولانا آزادؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے ملاتی ہوئے اور انہیں عزائم و مقاصد کی طرف توجہ دلائی تو حضرت مرحوم نے پہلی ہی صحبت میں اس سے کامل اتفاق ظاہر فرمایا۔

ترجمان القرآن میں سورہ توبہ کی ایک آیت پر نوٹ میں فرماتے ہیں:-

"۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا۔ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصدِ وقت پر توجہ دلاؤں، ممکن ہے چند اصحابِ رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے..... یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی۔"

مولانا محمد الہ دین قصوری کے نام ایک خط میں بھی مولانا نے اپنی ان کوششوں، علماء سے اپنی ملاقاتوں اور ان کے مایوس کن جواب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

حضرت شیخ الہند

مولانا آزادؒ کے نزدیک حضرت شیخ الہند کی مستثنیٰ شخصیت کے سوا ہندوستان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس مسئلے کی اہمیت و حقیقت اور منصبِ امامت کے فرائض و ذمہ داریات اور پھر موقتہ حالات کی بنا پر مشکلات و صعوباتِ راہ کا نکتہ شناس جو علمائے متاخرین میں حضرت شیخ الہند کی دعوت و عزیمت کا مولانا آزادؒ نے نہایت شاندار الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ ابھی چند سطرین پہلے منصبِ امامت کے خصائص و شرائط کا تذکرہ آیا تھا۔ چونکہ اس منصب کے لیے مولانا آزادؒ کی نظر انتخاب حضرت شیخ الہند پر پڑی تھی، اس لیے نامناسب نہ ہو گا کہ ان کی سیرت کے خصائص و کمالات پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ نظر و مطالعے کی اس ضرورت کے لیے مولانا آزادؒ ہی کا بیان کفایت

کرتا ہے۔

”مولانا مرحوم ہندوستان کے گزشتہ دور کے علماء کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس دورِ حرمان و فقدان میں علمائے حق کی اوصاف و خصائص کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمالِ حقہ میں بسر ہوا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ستر سال کی عمر میں جب ان کا قد ان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا۔ عین جوارِ حریم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک ججزیرہ ماٹیا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت انہیں صرف اس لیے برداشت کرنی پڑی کہ اسلام و ملتِ اسلام کی تباہی و بربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انہوں نے اعدائے حق کی مرمضات و ہوا کی تسلیم و اطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا۔

فی الحقیقت انہوں نے علماء و حق و سلف کی سنت تا مذکور دی اور علماء ہند کے لیے لیے اپنی سنتِ حقہ یادگار چھوڑ گئے۔“

یہ حقیقی ہندوستان کی وہ بزرگ ترین ہستی جو مولانا کے نزدیک منصبِ امامت کی اہل تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا کے اصرار پر یہ منصب قبول کر لینے پر آمادہ بھی ہو گئے تھے اور یہ بات طے پا گئی تھی کہ ہندوستان میں نظمِ جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے گا لیکن اس کے مقصد سے ہی عرصے بعد ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند نے سفرِ حجاز کا ارادہ کر لیا اور مولانا آزاد کے بقول ”میری کوئی منت و حاجت بھی انہیں سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ اس صورت میں کہ مولانا جس شخصیت کو اس منصب کے لیے اہل و مستحق سمجھتے تھے، درمیان میں موجود نہیں تھی اس امر عظیم کو ترک کر دیا جاسکتا تھا تاہم میں ڈالا جاسکتا تھا۔ مولانا نے اپنی ذمہ داری پر کام جاری رکھا۔

مولانا کی نظر بندی

اپریل ۱۹۱۶ء میں مولانا آزاد کو ملک سے اخراج کا حکم ملا۔ مجبوراً وہ رانچی چلے گئے۔ بعد میں وہیں انہیں نظر بند کر دیا گیا اور اس طرح کام کا نقشہ یکسر ٹٹ گیا۔ اور اگرچہ حوادث کی ہر شربانی اور واقعات کی الم ناکی اتنا درجہ کی تھی لیکن مولانا کی عزیمت و استقامت کے سامنے اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ مولانا کا ذہن و دماغ اس قدر شگفتہ و حاد تھا کہ اس نے اس کے لیے ایک نیا ہیرو بنا دیا تھا۔ پیغام کے مقالہ

انتہائی میں لکھتے ہیں:-

”عین ۱۹۱۸ء کے اواخر عہد میں جب کہ امیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سبے سیلاب حوادث پورے زور و شور کے ساتھ گزر چکا تھا، تو میں رانچی کے گوشہ عزلت میں بیٹھا ہوا، ایک نئی دنیا نے امید کی تعمیر کا سر سامان دیکھ رہا تھا اور گو دنیا نے دروازے کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے۔“

تفاوت است میان شنیدن سن و تو

تو لبقتن در یون فتح باب می شنوم

۱۹۱۸ء کے رمضان المبارک کا پہلا سہفہ اور اس کی بیدار و معور راقب کہ جب میں نے انہی باتوں سے امیدوں اور آرزوؤں کے نئے نقشوں پر لکیریں کھینچیں، جن سے تمام پچھلے نقشے پاک کر چکا تھا۔“

نیا نقشہ کار

اس نئے نقشہ کار کے مطابق مولانا کے پیش نظر تین بڑے مقاصد و مہمات تھے۔

۱۔ رفقاء و طالبین کی ایک جماعت کی تعلیم و تربیت

۲۔ تصنیف و تالیف

۳۔ جماعتی اعمال یعنی تنظیم جماعت

ان میں سے طالبین حق کی تعلیم و تربیت کا کام قید سے رہائی اور آزادی کے بغیر انجام نہیں پاسکتا تھا لیکن دوسرے امور پر انہوں نے اسی زمانے میں توجہ دی چنانچہ ان کے اوقات نظر بندی کا بڑا حصہ اپنے افکار کی ترتیب و تالیف میں بسر ہوا۔ امر ثالث پر عمل کے لیے بھی نقل و حرکت کی آزادی کی ضرورت تھی لیکن ایام نظر بندی میں بھی جس حد تک حالات نے اجازت دی ان سے فائدہ اٹھانے میں غفلت نہیں کی۔ چنانچہ صوبہ بہار کے احباب و مخلصین کو جن سے اس زمانہ میں بھی ربط تھا۔ مولانا نے توجہ دلائی اور کام کی ابتداء کر دی۔

ربانی کے بعد کوشش

جنوری ۱۹۲۰ء میں مولانا رام باہونے توان کے پیش نظر کاموں کا یہی نقشہ تھا اور وہ اسی میں مصروف رہنا چاہتے تھے لیکن حالات کی نزاکت اور ملکی اور ملی مقاصد کی ناگزیر احتیاجات کی وجہ سے مولانا کو وقت اور ضرورت کے مطابق فیصلہ کر لینا پڑا۔ اس حالت میں قرارداد اسلوب عمل کی پہلی شقوں پر تو عمل نہیں ہو سکتا تھا لیکن تنظیم جماعت کا کام جاری رکھا جاسکتا تھا۔ چنانچہ تحریک خلافت کے ساتھ تنظیم جماعت کے کام کو آگے بڑھانے اور تمام صوبوں تک اس دعوت کو پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے اپنے مخلصین اور علمائے کرام کو اس طرف توجہ دلائی اور وسط سال تک وہ پورے ملک میں تنظیم جماعت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ صرف دائرہ عمل کی توسیع کا مرحلہ باقی رہ گیا۔ مولانا عبدالرزاق طبع آبادی کے نام ۱۳ جولائی ۱۹۲۰ء کے خط میں لکھتے ہیں :-

”گزشتہ ماہ کے اواخر میں مبنی گیا تھا تاکہ تمام معاملات ایک قطعی اور مختتم صورت اختیار

کر لیں..... سجدہ اللہ معاملہ تنظیم جماعت من کل الوجہ اتمام کو پہنچا۔ جزئیات و

تفصیلات بھی طے پا گئیں۔ اب بجز توسیع دائرہ عمل کے کوئی مرحلہ باقی نہیں ہے اور وہ توفیق

الہی پر موقوف ہے..... بہر حال دائرہ عمل مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب سندھ، بنگال بالکل

متفق و متحد ہے اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے“

صوبوں میں تنظیم جماعت

اس وقت مختلف صوبوں میں تنظیم کی صورت یہ تھی۔

۱۔ پنجاب میں مولانا داؤد غزنوی امرتسری اور مولانا عبد اللہ قصوری علیہما الرحمۃ اور مولانا محی الدین احمد

قصوری مدظلہ، مولانا کے خلفائے مجاز اور تنظیم جماعت کے کاموں کے ذمہ دار تھے۔ مولانا سید داؤد

غزنوی پنجاب میں علمائے اہل حدیث کے گل سرسید اور علمائے سلف کی آخری یادگار تھے۔ مولانا

عبد اللہ مرحوم مولانا عبد القادر قصوری کے چھوٹے بھائی تھے اور مولانا محی الدین قصوری ان دہلوی

عبد القادر اسکے بیٹے تھے۔ یہ خاندان پنجاب میں اپنی دینی و دنیوی خدمات اور علم و فضل کی وجہ سے نہایت

عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

۲۔ سندھ میں پیر سید شاہ علی شاہ شہیدی مولانا کے خلفائے مجاز اور تنظیم جماعت کے کاموں کے ذمہ دار

تھے۔ پیر صاحب مرحوم ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں قبر علی خاں کے رہنے والے تھے اور اپنی دنیا کی اور قومی خدمات کے لیے کافی مشہور تھے۔

۳۔ یوپی میں مولانا عبدالرزاق طبع آبادی مامون و مامور تھے۔ انہوں نے لکھنؤ کو اپنا مرکز بنا کر کام شروع کیا اور چند ماہ کے اندر تنظیم جماعت کے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ مرحوم اپنے جذبات صادقہ اور جوش عمل کی بنا پر بڑی خصوصیت رکھتے تھے۔

۴۔ صوبہ بنگال کے صدر مقام کلکتہ میں خود مولانا کی ذات گرامی دعوت اور تنظیم جماعت کے کاموں کے لیے مرکزی حیثیت رکھتی تھی اور وہ خود سرگرمی کے ساتھ بیعت و ارشاد کے کاموں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا کے سوا کسی ماذون و مجاز کا پتہ نہیں چل سکا لیکن ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد منیر الزمان اسلام آبادی امارت شرعیہ اور نظم جماعت کے قیام کے لیے کوٹناں نظر آتے ہیں۔ شاید وہ مولانا کی جانب سے ماذون و مامور ہوں۔ اس خیال کو اس بات سے مزید تقویت پہنچتی ہے کہ مولانا سجاد بہاری سے ان کے قریبی تعلقات بلکہ عقیدت کی بیشی اور نیاز مندی کے تعلقات تھے۔

۵۔ مولانا ابوالحسن محمد سجاد مرحوم بہار میں تنظیم جماعت اور امارت شرعیہ کے قیام کے لیے مولانا کی جانب سے مامور تھے۔ مولانا آزادؒ سے ابوالحسن کے تعلقات معلوم و مشہور ہیں مولانا آزادؒ نے انہیں اپنے مخلصین و محبین میں شمار کیا ہے۔ انہی کی کوششوں سے صوبہ بہار میں امارت شرعیہ اور نظم جماعت کا قیام سب سے پہلے عمل میں آیا اور ۱۹۲۱ء میں جمعیتہ العلما بہار کے جلسے میں تین سو علمائے بالافتاح حضرت مولانا سید بدیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امیر شرع منتخب کر لیا۔

چند مریدین مخلصین

مولانا کے ان خلفائے مجاز کے علاوہ سینکڑوں مرید تھے ان میں سے جن کے نام معلوم ہو سکے

۱۔ لکھنؤ میں مولانا عبدالرزاق طبع آبادی کو چند ماہ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس دوران میں انہوں نے کرسچین کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی کے بہت سے طلبہ، مولوی گنج کے بہت سے مسلمانوں اور درپر گنج کے کچھ اطباء کو حلقہ بیعت میں داخل کیا۔ جن کی مجموعی تعداد کئی سو تھی۔ ان میں سے گوکہ گنج کے منے خاں ظفر الملک مولوی اسحاق ایڈیٹر الناطق کے بڑے بھائی مولوی شفاعت علی اور طبع آباد کے سردار محمد خان کے

۱۔ میں

- ۱۔ خواجہ عبدالحی فاروقی
۲۔ مستری محمد صدیق مرحوم (کپور تھلہ)
۳۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (امر تسر)
۴۔ شیخ قمر الدین مرحوم (لاہور)
۵۔ مولانا غلام رسول مہر (لاہور)
۶۔ غالباً سب سے آخری شخص جنہوں نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مولوی محمد یونس خالدی (لکھنؤ) ہیں۔

میتاق اسلامی

جب کوئی صاحب اخلاص مسلمان جماعتی زندگی کی اہمیت کو سمجھ لیتا اور نظم جماعت کا پابند اور احکام شرعیہ کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر صدق دل سے آمادہ ہو جاتا تو مولانا اس سے سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مطابق ایک عہد لیتے تھے۔ یہ عہد خانقاہی نظام اور تصوف کے کسی خاص سلسلے کے اعتقاد و وابستگی کا عہد نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے اخلاص نیت کے سامنے احکام شریعت کے کامل اتباع پوری زندگی کو مرضیات الہی کے حوالے کر دینے اور اپنے تمام موقوفات، مملوکیات اور تمام تعلقوں اور رشتوں سے زیادہ اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت کو اور اپنے تمام ذاتی و انفرادی مفادات کے مقابلے میں اجتماعی اور امت کے مصالح کو زیادہ عزیز و مقدم رکھنے اور اس کے لیے اپنی جان، اپنا مال اور اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے کا عہد ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں مولانا کی دو تحریریں پیش نظر ہیں۔ ایک تحریر ۱۹۲۱ء کی ہے اور مولانا ابو الکلام آزاد کا پیام عزیزان پنجاب کے نام کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا غلام رسول مہر نے یہ نایاب تحریر "نقش آزاد" میں شامل کر کے ضائع ہونے سے محفوظ کر دی ہے۔ دوسری تحریر بیت کا وہ مسودہ ہے جو مولانا نے عبدالرزاق طبع آبادی کو لکھ کر دیا تھا چونکہ پیش نظر مقصد کی وضاحت کے لیے ایک تحریر کفایت کرتی ہے۔ اس لیے یہاں دوسری تحریر نقل کی جاتی ہے۔

أَمَنْتُ بِاللَّهِ وَبِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَأَمَنْتُ بِرَسُولِ اللَّهِ وَبِمَا جَاءَ مِنْ عِنْدِ رَسُولِ اللَّهِ وَأَسْلَمْتُ وَأَقُولُ إِنَّ مَلَائِكَةَ اللَّهِ وَمُحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَهُ شَرِّ إِلَهَ لِي وَبِذَلِكَ أُمِدَّتْ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ

بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء و نائبین کے اس

بات پر کہ۔

۱۔ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعتقاد اور عمل پر قائم رہوں گا۔ اگر استطاعت پائی۔

۲۔ پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا، رمضان کے روزے رکھوں گا، زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا۔ اگر استطاعت پائی۔

۳۔ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا۔ برائی کو روکوں گا، صبر کی وصیت کروں گا۔

۴۔ میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵۔ اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے،

اپنے مال سے، اپنے اہل و عیال سے، دنیا کی ہر نعمت اور دنیا کی ہر لذت سے زیادہ

اللہ کو، اس کے رسول کو، اس کی شریعت کو، اس کی امت کو محبوب رکھوں

گا اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب و سنت کے مطابق دیا جائے گا سمع والطاعة

کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

شیخ الہند کی ہندوستان واپسی

مارچ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند کو مالٹا کی نظر بندی سے رہائی ملی اور جون میں وہ ہندوستان

پہنچے لیکن نظر بندی کے زمانے کی سخت تکالیف سے ان کی صحت تباہ ہو چکی تھی۔ اس وقت ان

کی عمر ۶۹ برس کی تھی۔ اگرچہ ان کے دل میں کبھی بکھنے والی ایمان کی انگلی تھی دھک رہی تھی۔ لیکن

ان کا جسم امت کے غم میں گھل چکا تھا۔ تو بنی جواب دے چکے تھے ان کے لیے ملکن زمحقہ کوئی

ذمہ داری اٹھائیں۔ ہندوستان تشریف لانے کے بعد وہ تقریباً چھ ماہ زندہ رہے یہ مدت بھی عوارض

و معالجات کی فکر میں گزری۔

لہ ہندوستان تشریف لانے کے بعد حضرت شیخ الہند کی صحت اور ان کے شب و روز کے مشاغل ملی

کے بارے میں حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب فرماتے ہیں۔ "حضرت شیخ الہند ہندوستان تشریف

لانے تو مرض الموت کا آغاز تھا۔ آپ کو وجع البفاصل کا قدیم سے عارضہ تھا۔ کثرت بول کی شکایت بھی

(باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے باوجود حلقہ دیوبند کے بعض حضرات کی نہایت مخلصانہ خواہش تھی کہ حضرت شیخ الہند اس منصب کو قبول فرمائیں۔ دوسری طرف حلقہ فرنگی محل مولانا عبدالباری کی امامت کے لیے کوشاں تھا۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) پرانی تھی۔ اس پر مالٹا کا سرد موسم اور مزید برآں حضرت والا کی شب بیداری ریاضت اور قلت غذا، بایں ہمہ پیرانہ سالی اور پھر ترکوں کی شکست اور اپنی جدوجہد کی ناکامی کا صدمہ ان تمام اسباب کی بنا پر گویا مرض کا سلسلہ مالٹا ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ پھر تقریباً تین ماہ تک راستے کی مشقت، اور ہندوستان پہنچنے کے بعد مغلقات کا جھوم، تحریک کی ترقی، مشاغل کی کثرت، یہ سب چیزیں اضافہ مرض کا سبب بنتی رہیں۔ انتہا یہ کہ آپ کو دق ہو گئی۔ مگر درحقیقت اس شیخ طریقت اور شیخ سیاست کی ہمت و استقلال، ہر ایک مسلمان بلکہ ہر ایک انسان کے لیے سبق آموز ہے کہ تب دق کا آخری ایسٹج ہے۔ چلنا پھرنا تو درکنار بیٹھنا بھی ممکن نہیں مگر اس حالت میں بھی تحریک کی قیادت جاری ہے۔ اجلاسوں کی شرکت کے لیے سفر ہو رہا ہے، صدارت فرمائی جا رہی ہے الغلطہ اللہ، عقل و نگہ رہ جاتی ہے کہ بستر مرگ پر ایک شیخ فانی کا یہ بے پناہ جذبہ عمل۔ ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو جامعہ اسلامیہ کے افتتاح کے لیے اس حالت میں تشریف لے گئے تھے کہ ڈول میں پڑ کر جلسہ گاہ تک پہنچے تھے۔ چند منٹ بیٹھ کر معی خطاب کرنا مشکل تھا۔ مختصر سا خطبہ صدارت تھا، لیکن علامہ شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا تھا۔ ۱۸ تا ۲۰ نومبر کو دہلی میں جمعیتہ العلماء ہند کا دوسرا سالانہ جلسہ آپ کی صدارت میں تھا لیکن بیماری اور نقاہت کی وجہ سے آپ کے لیے ایسٹج پر تھوڑی دیر بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ خطبہ صدارت لکھا ہوا تھا اور کسی ادب نے پڑھ کر سنایا تھا۔ اسی زمانے میں جامعہ اسلامیہ کا دہلی میں سنگ بنیاد آپ کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔ دہلی میں ۳۰ نومبر ۲۰۰۱ء کو آپ نے اس جہان فانی سے انتقال فرمایا اور مسلمان اس روح عظیم و مقدس کے دوجو گرامی اور اس کی رہنمائی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے

والسلام علیہ ورحمۃ اللہ

شیخ الہند کی جانب سے مولانا آزاد کی تائید

مولانا عبدالرزاق یلح آبادی مرحوم مولانا آزاد کی امامت کے لیے میدان ہموار کر رہے تھے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے حضرت شیخ الہند سے ملاقات کی۔ اس کی روداد خود انہی کی ذہانی سینے میں ہے۔

”شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب مرحوم و مغفور مالٹا کی نظر بندی سے چھٹ کر پہلی دفعہ لکھنؤ تشریف لائے اور فرنگی محل میں ٹھہرے۔ جرنلی کو فرنگی محل والے اس کوشش میں ہیں کہ مولانا عبدالباری صاحب کی امامت پر انہیں راضی کریں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خود شیخ الہند کے بعض رفیق شیخ کے لیے یہ منصب چاہتے ہیں..... میں نے شیخ الہند سے تنہائی میں ملاقات کی رسمی باتوں کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی امامت کا تذکرہ چھیڑا۔ شیخ نے فرمایا، امامت کی ضرورت مسلم ہے۔ عرض کیا حضرت سے زیادہ کون اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اس منصب کے لیے وہی شخص موزوں ہو سکتا ہے جو زیادہ سے زیادہ ہوش مند، مدبر اور فہمیت ہو۔ جس کی استیقامت کو کوئی تشویش متزلزل کر سکے نہ کوئی ترہیب..... شیخ الہند نے اتفاق ظاہر کیا تو عرض کیا آپ کی رائے میں اس وقت امامت کا اہل کون ہے؟ یہ بھی اشارہ کیا کہ بعض لوگ اس منصب کے لیے خود آپ کا نام لے رہے ہیں اور سبحانہ اہل بھی ہیں شیخ بڑی مصصویت سے مسکرائے اور فرمایا میں ایک لمحے کے لیے بھی تصور نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کا امام بنوں سے عرض کیا (باقی رہے)

ملاحظہ رہے کہ یہ واقعہ جولائی یا اگست، ۱۹۲۰ء کا ہے۔ اس ایک جملہ میں حضرت شیخ الہند نے اپنی پوری سیرت بیان کر دی ہے۔ لاریب ان کا غلوں ان کی بے نفسی اور لہیت اسی درجے کی تھی، وہ پہلے بھی صرف مولانا آزاد کے اصرار اور ملت اسلامیہ کے دینی و سیاسی مصالح کے پیش نظر اور کسی کو آمادہ نہ پا کر ہی منصب امامت قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہوں گے۔ اب انہوں نے دیکھا کہ تحریک کا کام شروع ہو چکا ہے اور مولانا آزاد اس کے لیے ہر طرح اہل اور آمادہ بھی ہیں تو فوراً خود کو اس سے الگ کر لیا اور مولانا آزاد پر اپنا اعتماد ظاہر فرما دیا۔ اسی طرح مجھے یقین ہے کہ اگر حضرت شیخ الہند ذرا بھی اس منصب کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آتے تو سب سے پہلے مولانا آزاد ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے کہ ان کی ملی در و منہی بھی اسی درجے کی تھی۔ بہر حال یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہند نے امامت کے لیے بیعت امامت کا